رضوان اللہ

البیان: خصائص و امتیازات

(۵)

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

۱۰۔ معنی کی تعیین اور سیاق و سباق سے متضاد دلائل

ضروری ہے کہ یہاں سیاق و سباق کی اہمیت کو اُس کے سلبی پہلو سے بھی بیان کر دیا جائے کہ معنی کی تعیین میں اُسے مدنظر رکھنے کے بجاے بعض اوقات قرآن کے خارج کو اہمیت دے دی جاتی ہے، حالاں کہ ایسا کرنا قرآن سمیت کسی بھی کتاب کو پڑھنے کا غیر علمی طریقہ ہے اور دینی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو یہ خارج کی چیز کو خدا کی کتاب پر حاکم بنا دینا ہے۔ البیان میں ہم دیکھتے ہیں کہ کسی مؤرخ کی لکھی ہوئی تاریخ ہو یا راوی کی روایت اور کسی ''مُلہم'' کے الہامات، ان سب کے مقابلے میں ہمیشہ سیاق و سباق کو ترجیح حاصل ہوتی ہے:

اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰہُ لِیُذْھِبَ عَنْکُمُ الرِّجْسَ اَھْلَ الْبَیْتِ وَیُطَھِّرَکُمْ تَطْھِیْرًا. (الاحزاب ۳۳: ۳۳)	''اللہ تو یہی چاہتا ہے، اِس گھر کی بیبیو کہ تم سے (وہ) گندگی دور کرے (جو یہ منافق تم پر تھوپنا چاہتے ہیں) اور تمھیں پوری طرح پاک کر دے۔''

اس آیت میں 'اَھْلَ الْبَیْتِ' کے الفاظ آئے ہیں جو اُن تمام افراد کے لیے استعمال کیے جا سکتے ہیں جو کسی شخص کے ساتھ اُس کے گھر میں رہتے ہوں۔ سیاق کلام اس معاملے میں بالکل واضح ہے کہ یہ الفاظ رسول اللہ کے گھر میں رہنے والے کچھ مخصوص افراد کے لیے آئے ہیں اور یہ مخصوص افراد وہی ہیں جنھیں آیت ۲۸ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ازواج اور آیت ۳۰ اور ۳۲ میں آپ کی عورتیں کہا گیا ہے اور جنھیں بالواسطہ اور

بلاواسطہ اس سلسلۂ کلام کے تمام احکام دیے گئے ہیں۔ سو یہ کسی صورت ممکن نہیں ہے کہ اس مقام پر محض کسی روایت[۲۲] کے زیر اثر ان سے آپ کے ازواج مطہرات کے سوا دوسرے لوگ مراد لے لیے جائیں، چاہے وہ آپ کے گھر میں رہتے ہوں یا آپ کے رشتہ دار ہوں یا وہ کسی درجے میں 'اَھۡلَ الۡبَیۡتِ' کے وسیع تر مفہوم کے تحت لائے جا سکتے ہوں۔ خارج کے مقابلے میں سیاق کو ترجیح دینے کا یہی اصول ہے کہ البیان میں ان کا ترجمہ واضح طور پر ان الفاظ میں کیا گیا ہے: ''اس گھر کی بیبیو''۔

مَا کَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنۡ رِّجَالِکُمۡ وَلٰکِنۡ رَّسُوۡلَ اللّٰہِ وَخَاتَمَ النَّبِیّٖنَ. (الاحزاب ۳۳: ۴۰)

''محمد تمھارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں، بلکہ اللہ کے رسول اور خاتم النبیین ہیں۔ (اِس لیے یہ ذمہ داری اُنھی کو پوری کرنی تھی)۔''

'خَاتَمَ النَّبِیّٖنَ' کے معانی نبیوں کی مہر کے ہیں۔ مہر تصدیق کے لیے بھی ہوتی ہے اور کسی شے کو مہر بند کرنے کے لیے بھی، اور یہ دوسرا مفہوم ہے جو اس آیت میں مراد لیا گیا ہے۔ سیاق میں اس کی دلیل یہ ہے کہ زید جنھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا منہ بولا بیٹا کہا جاتا تھا، یہاں اُن کی مطلقہ سے آپ کے نکاح کرنے کا معاملہ زیر بحث ہے۔ عرب کے رواج کے مطابق اس پر شدید قسم کا اعتراض اٹھتا تھا کہ اُن کے نزدیک اس طرح کا نکاح کرنا گویا اپنے سگے بیٹے کی مطلقہ سے نکاح کرنا تھا۔ سو فرمایا ہے کہ محمد تم میں سے کسی مرد کے باپ نہیں ہیں، یعنی زید کے بھی باپ نہیں ہیں، اس لیے اس نکاح پر معترض ہونے کی کوئی گنجایش نہیں ہے۔ لیکن وہ اللہ کے رسول ہیں، اس لیے ضروری ہے کہ وہ اس رسم بد کو مٹا دیں اور اس کے لیے زینب سے نکاح کریں۔ اب سوال پیدا ہوتا تھا کہ یہ کیا ممکن نہیں ہے کہ آپ کے بجاے بعد میں آنے والا کوئی پیغمبر اس رسم کا استیصال کرے تو اس کے جواب میں فرمایا ہے: 'وَخَاتَمَ النَّبِیّٖنَ'۔ وہ نبیوں کی مہر ہیں۔ یعنی، اس سلسلے کو مکمل طور پر بند کر دینے والے ہیں، اس لیے لازم ہے کہ یہ کام اب وہی انجام دیں۔ دیکھ لیا جا سکتا ہے کہ یہاں ان الفاظ سے یہی بات مقصود ہے، چنانچہ کشف، الہام اور کسی پر اترنے والے ''غیب'' کی بنیاد پر سیاق کی اس قطعی دلالت سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا اور نہ ان الفاظ میں کسی بروزی اور ظلی نبوت کی ''کھڑکی'' کو کھولا جا سکتا ہے[۲۳]۔ البیان میں ان لفظوں کو بیان کر دینے کے بعد سیاق کی اس دلالت پر یوں اصرار کیا گیا ہے کہ اُس کی توضیح قوسین کے اندر بھی

۲۲۔ ترمذی، رقم ۳۲۰۵۔

۲۳۔ ایک غلطی کا ازالہ، مرزا غلام احمد ۲۰۷۔

کر دی گئی ہے۔

كَمَآ اَخۡرَجَكَ رَبُّكَ مِنۡۢ بَيۡتِكَ بِالۡحَقِّ ۖ وَاِنَّ فَرِيۡقًا مِّنَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ لَكٰرِهُوۡنَ. (الانفال ۸: ۵)

''اسی طرح کی صورت اُس وقت پیش آئی تھی جب تمھارے پروردگار نے ایک مقصد حق کے ساتھ تم کو گھر سے نکلنے کا حکم دیا۔''

تاریخ اور سیرت کی روایات [۲۴] بیان کرتی ہیں کہ مسلمان مدینہ سے قریش کے تجارتی قافلے کو لوٹنے کے مقصد سے روانہ ہوئے تھے، مگر بعض وجوہات کی بنا پر بدر کے میدان میں اُن کی مڈ بھیڑ قریش کے لشکر سے ہوئی۔ دراں حالیکہ 'كَمَآ اَخۡرَجَكَ رَبُّكَ مِنۡۢ بَيۡتِكَ بِالۡحَقِّ' کے الفاظ دو باتیں بتا رہے ہیں: ایک یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ ہی سے اللہ کے حکم پر نکلے تھے اور دوسرے یہ کہ حق کے ساتھ نکلے تھے۔ یہاں حق سے مراد کیا ہے؟ 'يُجَادِلُوۡنَكَ فِى الۡحَقِّ' کے جملے کا حال ہونا اور اس میں بحث کرنے کا ذکر آنا، واضح طور پر بتا رہا ہے کہ اس سے مراد نہ محض خیر اور مصلحت تھی اور نہ واقع میں آ کر رہنے والی کوئی حقیقت کہ ان دو باتوں میں ابھی سے بحث کرنے کی آخر کیا ضرورت تھی؟ بلکہ اس سے مراد مستقبل میں حاصل ہونے والا کوئی مقصد تھا کہ جسے پانے کے لیے خروج کے وقت سے بحث شروع ہو گئی تھی۔ چنانچہ یہ 'الۡحَقّ' یہاں غایت اور مقصد کے مفہوم میں آیا ہے اور آیت ۷ میں اس کی وضاحت کرتے ہوئے بتا بھی دیا ہے کہ وہ حق سچ کا بول بالا کرنا اور آپ کے منکرین کی جڑ کو کاٹ دینا ہے۔ اسے اس زاویے سے بھی دیکھ لیا جا سکتا ہے کہ حق سچ کی بلندی اور منکرین کا خاتمہ جسے یہاں 'الۡحَقّ' کے بیان کے طور پر لایا گیا ہے، وہ محض تجارتی قافلہ لوٹ لینے سے کبھی حاصل نہیں ہو سکتا تھا، بلکہ اس کے لیے ضروری تھا کہ قریش کی اصل طاقت اور اُن کے مسلح لشکر پر کاری ضرب لگائی جائے، چنانچہ اس وجہ سے بھی یہ طے ہے کہ آپ کا ہدف مدینہ سے نکلتے وقت ہی قریش کا لشکر تھا۔ مزید یہ بات بھی سامنے رہے کہ اگلے جملوں میں بیان ہوا ہے کہ کم زور ایمان کے لوگ اس 'الۡحَقّ' کے ساتھ نکلنے کو سخت ناپسند کر رہے تھے، آپ کا منشا جان لینے کے بعد بھی آپ سے بحث کر رہے تھے اور اس وقت اُن کی حالت یہ تھی جیسے کوئی اُنھیں ہانک کر موت کی طرف لے جا رہا ہو۔ سو اس سے بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ مدینہ سے نکلتے ہوئے جو 'الۡحَقّ' سامنے تھا، وہ اصل میں مقصد حقیقی، یعنی قریش کے لشکر سے ٹکرا جانا تھا نہ کہ غیر مسلح اور مال و زر سے لدے ہوئے کسی تجارتی قافلے کی غنیمت کو مزے سے لوٹ لینا۔ تاریخی روایات کے

۲۴۔ ابن ہشام ۱/ ۶۰۶۔ زاد المعاد ۳/ ۱۵۳۔

مقابلے میں سیاق کلام کی یہی دلالت ہے کہ البیان میں 'الْحَقّ' کا ترجمہ ''مقصد حق'' کیا گیا ہے۔

عرف اور نظائر

لفظ کے مرادی معنی معلوم کرنے کے سلسلے کی یہ پانچویں چیز ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ علمی اور مستقل نوعیت کی کتابیں اپنا ایک عرف پیدا کرتی ہیں اور اگر وہ اس کے ساتھ نصیحت کی کتابیں بھی ہوں تو وہ اپنی بات کو مختلف مقامات پر ایک سے زائد مرتبہ بیان کرتی ہیں۔ قرآن کے بارے میں ہم جانتے ہیں کہ یہ بھی اپنے اندر کئی الفاظ کو عرف کی حیثیت دیتا اور آیات کی تصریف اور اُن کی تفصیل کرنے کے اصول پر ایک بات کو کئی طریقوں سے اور متعدد مقامات پر بیان کرتا ہے۔ صحیح ترجمہ کے لیے ضروری ہے کہ ان دو چیزوں پر پوری طرح نظر رکھی جائے کہ ان سے عدم واقفیت بہت زیادہ نقصان دیتی اور صحیح معنی تک پہنچنا مشکل اور کئی صورتوں میں بالکل ناممکن بنا دیتی ہے۔ ہم پہلے عرف کی چند مثالیں پیش کرتے ہیں:

وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ. (البقرہ ۲: ۴) ''اور وہ آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔''

عربی زبان میں لفظ 'آخرۃ' کا استعمال 'اُوْلٰی' کے مقابلے میں ہوتا ہے، یعنی ''پہلے'' کے مقابلے میں اس کا مطلب ہو گا ''آخری''۔ اس عام مفہوم کی رعایت سے کوئی چاہے تو اس سے آخری دور یا آیندہ زمانے میں ہونے والی کوئی بات بھی مراد لے سکتا ہے، جیسا کہ بعض حضرات نے ایسا کیا بھی ہے [۲۵]، مگر جو شخص زیر نظر آیت میں اس کے الف لام اور اس کے ساتھ آنے والے فعل 'اِیْقَان' اور اس سلسلۂ کلام پر استدراک در استدراک ہوتے ہوئے منکرین کا 'الیوم الآخر' کی صراحت کے ساتھ وہ دعویٰ سامنے رکھے گا جو آیت ۸ میں بیان ہوا ہے، وہ بہ خوبی جان لے گا کہ اس سے صرف اور صرف قیامت کے بعد کی دنیا مراد ہے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ قرآن کی اکثر آیات میں یہ اپنے عام معنی سے اوپر اُٹھ کر ایک خاص عرفی معنی میں استعمال ہوتا ہے اور اس کتاب کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ اُس وقت دنیا کے آخر میں آنے والی ایک دوسری دنیا ہی اِس سے مراد ہوتی ہے۔

اس طرح کی مثال قرآن میں بہت زیادہ استعمال ہونے والا ایک لفظ 'السَّاعَۃ' بھی ہے۔ عربی زبان میں اس کا مطلب ''پل، ساعت اور گھڑی'' ہے، مگر دیکھ لیا جا سکتا ہے کہ قرآن کے عرف میں اس کا مطلب اصل

۲۵۔ ''اور وہ آیندہ ہونے والی (معہود باتوں) پر (بھی) یقین رکھتے ہیں۔'' (مرزا بشیر الدین صاحب احمدی کی کتاب ''تفسیر کبیر''، ۱۳۵/۱)۔

میں قیامت کی گھڑی ہے۔ سو اس عرف کا لحاظ ہے کہ البیان میں اس کا ترجمہ کرتے ہوئے گھڑی، قیامت کی گھڑی، قیامت کا دن اور کہیں صرف قیامت کا لفظ استعمال کر لیا گیا ہے:

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرْسٰىهَا. (النازعات ۷۹: ۴۲)	''پوچھتے ہیں کہ آخر وہ گھڑی کب آ کر ٹھیرے گی؟''
قُلْ اَرَءَيْتَكُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُ اللّٰهِ اَوْ اَتَتْكُمُ السَّاعَةُ اَغَيْرَ اللّٰهِ تَدْعُوْنَ ۚ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ. (الانعام ۶: ۴۰)	''ان سے کہو، ذرا بتاؤ، اگر تم پر اللہ کا عذاب آجائے یا قیامت کی گھڑی آ پہنچے تو کیا اللہ کے سوا کسی اور کو پکارو گے، اگر تم (اپنے دعووں میں) سچے ہو؟''
بَلِ السَّاعَةُ مَوْعِدُهُمْ وَالسَّاعَةُ اَدْهٰى وَاَمَرُّ. (القمر ۵۴: ۴۶)	''نہیں، بلکہ اِن سے جو وعدہ ہے، اُس کے پورا ہونے کا اصل وقت تو قیامت کا دن ہے اور قیامت کا دن (ان منکروں کے لیے) بڑا سخت اور بڑا ہی تلخ ہو گا۔''
وَعِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ ۚ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ. (الزخرف ۴۳: ۸۵)	''اُسی کے پاس قیامت کا علم ہے اور اُسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔''

اب ہم قرآن کے عرف کی ایک نازک مثال پیش کرتے ہیں جس کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ شاید البیان کے سوا کسی اور ترجمہ میں اس کا لحاظ نہیں رکھا جا سکا:

وَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّبِيٍّ اِلَّآ اَخَذْنَآ اَهْلَهَا بِالْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ يَضَّرَّعُوْنَ. (الاعراف ۷: ۹۴)	''ہم نے جس بستی میں بھی کسی نبی کو رسول بنا کر بھیجا ہے، اُس کے لوگوں کو مالی اور جسمانی مصیبتوں میں مبتلا کیا ہے تاکہ وہ عاجزی اختیار کریں۔''

عربی زبان میں 'ارسال' کے اصل معنی ''بھیجنا'' کے ہیں، اور اس معنی میں یہ قرآن میں بھی آیا ہے جہاں حضرت موسیٰؑ اپنے خدا سے ان الفاظ میں درخواست کرتے ہیں: 'فَاَرْسِلْهُ مَعِيَ رِدْاً'[۲۶]۔ ہارون کو میرے ساتھ ''بھیج دیجیے'' کہ میری تائید کرے۔ یہ ''بھیج دینا'' بعض صورتوں میں ''چھوڑ دینے'' کو بھی مشتمل ہو جاتا ہے، چنانچہ سیدنا موسیٰ کا مصر کے فرعون سے مطالبہ ان لفظوں میں بیان ہوا ہے: 'فَاَرْسِلْ مَعِيَ بَنِيٓ

۲۶۔ القصص ۲۸: ۳۴۔

اِسْرَآءِیْل ''[۲۷]، یعنی بنی اسرائیل کو ''چھوڑ دو'' کہ میرے ساتھ جائیں۔ بعض اوقات یہ ''چھوڑ دینے'' کا مفہوم اپنے لوازم کے لحاظ سے کسی پر ''مسلط کر دینے'' کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے، جیسا کہ فرمایا ہے: 'وَّاَرْسَلَ عَلَیْهِمْ طَیْرًا اَبَابِیْلَ '[۲۸]۔ اور اُن پر جھنڈ کے جھنڈ پرندے مسلط نہیں کر دیے؟ بہر حال، ہمارے پیش نظر ان تمام مفاہیم میں سے سرِ دست اس لفظ کا اصل مفہوم ہے۔ قرآن نے اس مفہوم میں اسے کسی شخصیت، نبی یا رسول کو لوگوں کی طرف بھیجنے کے لیے بھی استعمال کیا ہے، اور ظاہر ہے یہ اس کے اصل اور عام استعمال کی ایک مثال ہے۔ اس سے آگے بڑھ کر قرآن نے بعض اوقات صرف 'ارسال' سے نبی اور رسول بھیجنے کا مفہوم بھی ادا کیا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ قرآن کا اپنا پیدا کردہ عرف ہے اور تراجم میں بالعموم اس کی کافی حد تک رعایت پائی جاتی ہے۔ لیکن اس سے بھی آگے بڑھتے ہوئے قرآن نے یہ کمال کیا ہے کہ اسے نبی کو ایک خاص منصب دینے، یعنی رسول بنا کر بھیجنے کے لیے بھی استعمال کر لیا ہے اور یہی وہ عرف ہے کہ جس کا مکمل طور پر ادراک ہمیں صرف البیان میں ملتا ہے، جیسا کہ مذکورہ بالا آیت میں کہ جہاں اس کا ترجمہ ان الفاظ میں کیا گیا ہے: ''کسی نبی کو رسول بنا کر بھیجا ہے۔''

یاد رہے کہ 'ارسال' کے اس عرف کی پہچان جس طرح قرآن کے دیگر مقامات پر مسلسل غور و خوض کرنے سے حاصل ہوتی ہے، اسی طرح اُس شخصیت کے تعارف اور اُس کے کام کی نوعیت سے بھی حاصل ہو سکتی ہے جس کے بارے میں معلومات بعض اوقات زیر مطالعہ آیت میں بھی مل جایا کرتی ہیں۔ مثال کے طور پر ذیل کی یہ آیت:

لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰی قَوْمِهٖ. ''ہم نے نوح کو اُس کی قوم کی طرف رسول بنا کر بھیجا تھا۔'' (الاعراف ۷: ۵۹)

دیکھ لیا جا سکتا ہے کہ اس آیت سے متصل بعد کی آیات حضرت نوح کے انذار کی تفصیلات کو بیان کر رہی ہیں جس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ یہاں 'اَرْسَلْنَا' کا مطلب اُنھیں رسول بنا کر بھیجنا ہے۔ مزید یہ کہ اس کے بعد آنے والے مختلف رسولوں کے واقعات اور بالخصوص آیت ۱۰۱ میں ان سب ہستیوں کے لیے آئے ہوئے 'رُسُلُهُمْ' کے الفاظ، یہ سب بھی اس بات کو مکمل طور پر واضح کر دیتے ہیں۔

۲۷۔ الاعراف ۷: ۱۰۵۔

۲۸۔ الفیل ۱۰۵: ۳۔

اسی طرح یہ آیت بھی اگر سیاق میں پائی جانے والی تفصیلات کو دیکھ لیا جائے تو اس کی ایک اچھی مثال ہے:

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰی بِاٰیٰتِنَا وَسُلْطٰنٍ مُّبِیْنٍ. اِلٰی فِرْعَوْنَ وَمَلَاْئِہٖ فَاتَّبَعُوْٓا اَمْرَ فِرْعَوْنَ. (ہود ۱۱: ۹۶-۹۷)

''اسی طرح موسیٰ کو ہم نے اپنی نشانیوں کے ساتھ اور ایک کھلی ہوئی سند کے ساتھ فرعون اور اُس کے سرداروں کی طرف رسول بنا کر بھیجا تھا تو انھوں نے فرعون کی بات مانی۔''

یہاں ضمنی طور پر یہ بات بھی سامنے رہے کہ بعض اوقات قرآن میں کوئی لفظ اپنے عرفی معنی میں آتا ضرور ہے، مگر وہ عرف ابتداءً قرآن کا پیدا کردہ نہیں ہوتا، بلکہ وہ اُس کے مخاطبین میں اس حیثیت سے پہلے سے رائج ہوتا ہے۔ لہٰذا مترجمین کے لیے لازم ہے کہ وہ قرآن کے ساتھ ساتھ اُس وقت کے عرف سے بھی واقفیت بہم پہنچائیں کہ اس سے مطلق بے پروا ہو کر اور محض لغت کی بنیاد پر معنی کی تعیین کرنے کی کوشش کرنا، ترجمۂ قرآن کا قطعی طور پر غلط اور غیر علمی طریق ہے۔ مثال کے طور پر 'اِقَامَۃُ الصَّلٰوۃ' کے الفاظ قرآن اور اس کے مخاطبین، دونوں کے عرف کے مطابق ایک خاص قسم کی عبادت، یعنی نماز کا اہتمام کرنے کے لیے آتے ہیں، چنانچہ اُنھیں اب ''قوانین خداوندی کے اتباع'' کے معنی میں یا اسی طرح کے کسی اور معنی میں لینا کسی لحاظ سے بھی درست نہ ہو گا[۲۹]۔''

جہاں تک نظائر کا معاملہ ہے تو ان کے بارے میں مترجمین کے ہاں بسا اوقات افراط و تفریط کا رویہ پایا جاتا ہے۔ وہ اس طرح کہ بعض حضرات کے نزدیک قرآن کا کوئی ایک لفظ بھی اُس کے نظائر کو سامنے لائے بغیر سمجھ میں آجائے، یہ بالکل محال ہے، حالاں کہ بہ ادنیٰ تامل جان لیا جا سکتا ہے کہ یہ دعویٰ سراسر غیر علمی اور غیر فطری ہے۔ غیر علمی اس لیے کہ الفاظ متعدد پہلوؤں سے استعمال کیے جاتے ہیں اور یہ ضروری نہیں ہوتا کہ وہ کسی کتاب میں اگر ایک مقام پر ایک معنی میں آئیں تو دوسرے مقام پر بھی ضرور اسی معنی میں لائے جائیں۔ غیر فطری اس لیے کہ قرآن کی آیات اُس زمانے میں بھی جب پڑھی جاتی تھیں تو اُن کی دلالت اُن کے مخاطبین کے سامنے بالکل واضح ہوتی تھی اور یہ ضروری نہیں ہوتا تھا کہ وہ انھیں سمجھنے کے لیے پہلے اُن کے نظائر کو بھی لازماً دیکھیں۔ اس کے مقابلے میں بعض حضرات ان نظائر کی اہمیت کو مان لینے کے بعد پھر اس میں حد درجہ تساہل اور بے پروائی

۲۹۔ جیسا کہ بعض حضرات نے یہ غیر علمی طریق اپناتے ہوئے اس سے یہ معنی مراد لیا بھی ہے: لغات القرآن، غلام احمد پرویز ۱۰۳۶۔

کا شکار ہو جاتے ہیں اور اپنے اس طرز سے اس بات کا امکان بڑھا دیتے ہیں کہ قرآن کے اندر کسی ابہام اور مستقل تضاد کی کوئی کیفیت پیدا کر دیں۔ ہمارے نزدیک ان نظائر کی صحیح حیثیت صرف یہ ہے کہ یہ توضیحِ مزید قسم کی چیز ہوتے ہیں اور ان سے معنی کی تعیین میں ایک طرح کی تائید اور یقین پیدا ہو جاتا ہے، و گرنہ قرآن کا ہر لفظ اپنے مقام اور اپنے سیاق میں قطعی طور پر واضح ہوتا ہے۔ بہر حال، ان کی واجبی اہمیت کو بیان کرنے کے لیے ہم ذیل میں چند مثالیں عرض کرتے ہیں:

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً.(البقرہ۲:۳۰)

”اور جب تمھارے پروردگار نے فرشتوں سے کہا: میں زمین میں ایک ایسی مخلوق بنانے والا ہوں جسے (اُس کی) بادشاہی دی جائے گی۔“

’خَلِيْفَة‘ کا لفظ عام طور پر نائب اور جانشین کے معنی میں آتا ہے۔ یہاں یہ بعض پہلوؤں سے مجرد ہو کر صرف صاحب اقتدار ہستی کے لیے آیا ہے۔ اس لیے کہ فرشتوں کے ذہن میں یہ سوال کہ انسان زمین میں خون ریزی اور فساد برپا کرے گا، اُسی صورت میں پیدا ہو سکتا ہے جب وہ اس لفظ سے یہ سمجھیں کہ اُسے زمین میں اقتدار دیا جا رہا ہے۔ تاہم، اقتدار کی اس دلیل کی بنیاد پر کوئی شخص یہ سوال کر سکتا ہے کہ اس لفظ سے نائب، یعنی خدا کا نائب کیوں نہیں مراد لیا جا سکتا؟ تو واضح رہے کہ اس اضافی بات کو مان لینے کی ایک ہی صورت ہو سکتی ہے کہ الگ سے یہ بھی ثابت کیا جائے کہ اللہ نے اُسے واقعہ میں اپنا نائب بنایا ہے اور اسے اپنے اختیارات بھی سونپ دیے ہیں،[۳۰] حالاں کہ نہ پہلی بات کی کوئی دلیل اس آیت سمیت کہیں پائی جاتی ہے اور نہ خدا کی ذات اپنے اختیارات کسی اور کو دیا ہی کرتی ہے۔ باقی رہا جانشین کا اضافی مفہوم تو وہ بھی یہاں مراد لینا کسی صورت ممکن نہیں۔ اس لیے کہ اسے خدا کا جانشین مان لینے کا یہ لازمی تقاضا ہو گا کہ ہم پہلے یہ مانیں کہ خدا اس زمین سے لا تعلق ہو گیا ہے یا اُسے کہیں اور چلے جانا ہے، حالاں کہ ہم جانتے ہیں کہ خدا کے بارے میں اس طرح کی کوئی بات فرض کر لینا بالکل محال ہے۔ مختصر یہ کہ اس سلسلۂ کلام میں ’خَلِيْفَة‘ کا لفظ ہر طرح سے واضح ہے کہ صاحب اقتدار ہستی کے لیے آیا ہے۔ اب اس کے بعد لفظ ’خلیفہ‘ کے اس استعمال کی کوئی نظیر اگر قرآن سے بھی مل جاتی ہے تو ظاہر ہے، یہ ہمارے موقف کی تائید اور اس کے لیے مزید تقویت کا باعث ہو گی۔ سو، یہ نظیر

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

۳۰۔ یاد رہے، یہاں خاص خدا کے اختیارات کی بات ہو رہی ہے، وگرنہ خدا کے دیے ہوئے اختیارات تو زمین کی دوسری مخلوقات کو بھی حاصل ہیں اور ہم کبھی اُنھیں خدا کے نائب کا نام نہیں دیتے۔

سورۂ ص (۳۸) کی آیت ۲۶ میں موجود ہے اور اس میں بھی 'خَلِیْفَة' سے نائب اور جانشین مراد لینے کے بجاے حاکم مراد لیا گیا ہے: 'یٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِیْفَةً فِی الْاَرْضِ'۔

كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ ۙ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا. (آل عمران ۳: ۳۷)

''جب کبھی زکریا محراب میں اُس کے پاس جاتا تو وہاں (اللہ کی) عنایت دیکھتا تھا۔''

رزق کا مطلب ''عطا کرنا'' اور ''دینا'' ہے۔ یہ عربی زبان میں صرف روزی روٹی تک محدود نہیں ہے، بلکہ اسے کسی بھی چیز کے دینے کے لیے برتا جا سکتا ہے۔ قرآن میں اس کا استعمال کھانے پینے کی مادی چیزوں پر بھی ہوا ہے اور ہدایت و معرفت جیسے معنوی انعامات پر بھی۔ مذکورہ آیت میں اس کا اطلاق حکمت و معرفت کے اُن کمالات پر ہوا ہے جو خدا کی طرف سے سیدہ مریم کو عنایت ہوئے۔ اس بات کی دلیل کے لیے مذکورہ آیت کے سلسلۂ کلام میں موجود کچھ باتیں ہمارے سامنے رہنی چاہییں: ایک یہ کہ زکریا علیہ السلام کو جو ایک برگزیدہ نبی تھے، کھانے پینے کی اشیا اور بے موسم کے پھل اُترنے جیسے واقعات میں آخر کیا دل چسپی ہو سکتی تھی؟ اُن کی اصل دل چسپی تو اُس حکمت و معرفت میں ہو سکتی تھی جس کا مظاہرہ وہ آئے روز مریم کے ہاں دیکھا کرتے تھے اور جنھیں دیکھ کر اُن کے اپنے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی تھی کہ پروردگار اُنھیں بھی اس طرح کی کوئی اولاد عطا فرمائے۔ دوسرے یہ کہ جب اُنھیں اولاد کی بشارت دی گئی تو اس میں معجزاتی طور پر کھانے پینے یا اس قبیل کی دوسری چیزوں کا وعدہ کرنے کے بجاے صاف لفظوں میں یہی کہا گیا کہ خدا بچے کو اُس حکمت و معرفت کی سب سے برتر صورت، یعنی نبوت سے بھی سرفراز فرمائے گا۔ سو سلسلۂ کلام کی یہ دلالت ہے کہ البیان میں رزق کا ترجمہ ''(اللہ کی) عنایت'' کیا گیا ہے اور تشریحی نوٹ میں یہ وضاحت بھی کر دی گئی ہے کہ اس سے مراد اصل میں کیا چیز ہے۔ جہاں تک اس کی تائید میں کوئی نظیر لانے کی بات ہے تو اس کے لیے سورۂ ہود (۱۱) کی آیت ۸۸ کے یہ الفاظ دیکھ لیے جا سکتے ہیں جن میں 'رزق' کے لفظ کا اطلاق شعیب علیہ السلام پر اترنے والی وحی پر کیا گیا ہے: 'وَرَزَقَنِیْ مِنْهُ رِزْقًا حَسَنًا'۔

یہاں ہم ضمنی طور پر یہ بھی عرض کر دیں کہ جس طرح لفظ کے معنی کی تعیین میں نظائر سے مدد لی جاتی ہے، اسی طرح بعض مقامات کی تفسیر کرنے میں بھی انھیں ایک خاص حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ اس کی مثال میں ہم صرف ایک آیت پیش کیے دیتے ہیں:

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ. (البقرہ ۲: ۲)

''یہ کتاب الٰہی ہے، اِس کے کتاب الٰہی ہونے میں کوئی شک نہیں۔''

بعض حضرات کے مطابق 'لَا رَيْبَ فِيْهِ' کے اس جملے کا مطلب ہے کہ قرآن کے اندر کوئی شک کی بات نہیں۔ البیان میں اس کا مطلب یوں بیان کیا گیا ہے: ''اس کے کتاب الٰہی ہونے میں کوئی شک نہیں''۔ اس مطلب کی دلیل یہ ہے کہ پچھلے جملے، یعنی 'ذٰلِكَ الْكِتٰبُ' کے الفاظ کا درست ترجمہ یہ بنتا ہے: ''یہ اللہ کی کتاب ہے''، اور اس کی وجہ کتاب پر آنے والا الف لام اور خود لفظ کتاب کا اپنے برتر مفہوم میں خاص ہو کر استعمال ہونا ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو ''یہ اللہ کی کتاب ہے'' کے الفاظ اصل میں دعویٰ کے طور پر آئے ہیں، چنانچہ اس کے بعد یہ کہنا ہی زیادہ موزوں ٹھیرتا ہے کہ ہاں اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ واقعتاً اللہ کی کتاب ہے۔ مزید یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ قرآن کے منکرین اس کتاب کے اندر کسی شک کے ہونے یا نہ ہونے میں کبھی بھی متردد نہ تھے، بلکہ اُن لوگوں کا تردد اصل میں اس کے خدا کی طرف سے اترنے یا نہ اترنے میں تھا، چنانچہ اس وجہ سے بھی اس کے منزل من اللہ ہونے کو ظاہر کرنا ہی قرین قیاس بنتا ہے۔ یہ وجوہ ہیں کہ البیان میں اس کا مطلب مذکورہ بالا الفاظ میں ادا کیا گیا ہے اور اس کی مزید وجہ وہ نظائر بھی ہیں کہ جن میں اس بات کو بالکل کھول کر بیان کر دیا گیا ہے۔ جیسا کہ سورۂ سجدہ (۳۲) کی آیت ۲ میں فرمایا ہے: 'تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ'۔

[باقی]

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com